# بلوچستان کے اردو افسانے میں ثقافت کے فکری عناصر

عطیہ فیض بلوچ

Abstract:

Balochistan's three major tribes Baloch, Bravhi and Pashtoon which are the important pillars of its culture of whose civilizations and social aspects have been sorted out. The three different periods of Urdu short stories written in Balochistan are mentioned and than the intellectual elements of cultures are observed accordingly.

کہانیاں کہنے اور سننے کا فن اسلاف سے چلاآرہا ہے۔گھر کے بزرگ رات کے وقت بچوں کو مختلف قسم کی کہا نیاں سناتے جو سبق آموز بھی ہو تیں اور اخلاقیات پر مبنی بھی۔یہ عمل کسی خاص وقت یا موسم کا پابند نہیں ہوتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں صحن میں چارپائیوں پر اور سردیوں میں بند کمرے میں الاؤ کے گرد قصے کہانیوں کا بیان جاری رہتا۔اسی طرح سینہ بہ سینہ یہ عمل آگے بڑھتا رہا اور قصے کہانیوں نے دنیا میں مقبولیت حاصل کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں نکھار آتا گیا لیکن وہ فنی لحاظ سے جدید افسانے سے یکسر مختلف ہیں۔افسانے کی ابتداء انیسویں صدی میں انگلستان میں ہوئی وہاں کے افسانہ نگاروں نے نہ صرف افسانے کو ایک علیحدہ صنف قرار دیا ہے۔بلکہ اس کے قوا عد وضوابط بھی متعین کیے۔عوام وخواص میں افسانے کی مقبولیت نے یہاں کے افسانہ نگاروں کو اچھی تخلیقات کے لیے سوچ وبچار پر مجبور کیا۔ابتدا میں اردو کی ادبی تحریروں اور مختلف اصناف کی تصنیف وتالیف کے لیے کراچی اور لاہور بڑے مراکز تھے وہاں پر اردو زبان میں اعلیٰ پائے کے افسانے تحریر کیے جانے لگے۔ بلوچستان میں اُس وقت فارسی کا دور دورہ تھا لہٰذا اسی زبان میں علمی تحریریں قلمبند ہونے لگیں سیاسی حالات کی تبدیلی نے آہستہ آہستہ اہل بلو چستان کو بھی فارسی کے ساتھ اردو زبان کو اپنانے پر مجبور کیا۔ یہاں کے لوگوں نے بھی اردو کو گلے لگایا اور عام بول چال سے لے کر علمی وادبی تحریروں میں اسے برتنے لگے۔اور بڑھتے وقت کے ساتھ اس زبان میں مہارت حاصل کر لی۔بقول ڈاکٹر انعام الحق کوثر:

"بلوچستان کے باشندے بھی دوسرے پاکستانیوں کی طرح اردو میں اظہار خیال پر اتنے ہی قادر ہیں جتنے خود اپنی زبانوں میں ہو سکتے ہیں۔" (۱)

اس خطے میں اردو زبان کے آنے سے یہاں کے ادیبوں نے اردو میں شاعری، ناول نگاری، ڈرامہ اور افسانہ نگاری پر توجہ مرکوز کی اور اردو کے ادبی سرمائے میں اضافہ کیا۔ ابتدا میں اردو افسانے کا پس منظر بہت زیادہ مضبوط دکھائی نہیں دیتا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر مقامی زبانوں (بلوچی، براہوی، پشتو، فارسی) میں بھی افسانے لکھے جا رہے تھے اس لیے اردو میں ابتدائی طور پر کم افسانے دکھائی دیتے ہیں۔ ارتقائی دور کے پس منظر میں یہاں کے اردو افسانے کو دیکھا جائے تو تین اہم ادوار سامنے آتے ہیں۔

۱۔ دور اوّل: قیام پاکستان تک کی افسانہ نگاری

۲۔ دور دوئم: ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک (بلوچستان کو صوبائی حیثیت ملنے تک)

۳۔ دور سوئم: ۱۹۷۲ء تا حال

یہاں کا اردو افسانہ فکری عناصر کے اعتبار سے تینوں ادوار میں مختلف رہا ہے۔ ان ادوار کی تحریروں میں افسانوں کا ماحول، موضوعات، عنوانات، ثقافتی رجحانات وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ فکری عناصر کا تعلق تاریخ سے ہے اس لیے آج کا انسان اسے اہم سمجھتا ہے اور زوال پزیر نہیں ہونے دیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ تاریخ سے اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح جڑا رہے وہی تاریخ ہمیشہ زندہ رہتی ہے جس میں بزرگوں کے کارنامے سینہ بہ سینہ چلیں۔ ہر نئی نسل اپنے بزرگوں سے گہرا لگاؤ رکھتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ اس کے اسلاف کے بارے میں آنے والی نسلیں جان سکیں۔ اور آنے والے دور میں وہ خود بھی اس کا حصہ بنے۔

ثقافت کے فکری پہلو کو یہاں کے اردو افسانے کے دور اوّل میں دیکھا جائے تو اس میں ایسا کوئی قابل ذکر افسانہ نہیں ملتا جس میں اس پہلو پر بات کی گئی ہو۔ یہ دور تقسیم سے پہلے کا تھا۔ اس وقت عوام الناس میں ملک کے حصول کی کوششیں بیدار کی جا رہی تھیں۔ اس میں ادیب بھی اپنا کردار ادا کر رہا تھا لہٰذا جوش و جذبے کی باتیں افسانوں میں برتی جا رہی تھیں اور ثقافت کا فکری پہلو افسانوں میں جگہ نہ پا سکا اردو افسانے کے دوسرے دور میں بھی فکری عناصر نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کے اکثر افسانہ نگار غیر مقامی تھے جبکہ ثقافت کا تعلق مقامی آبادی سے ہوتا ہے۔ اپنی ثقافت سے متعلق جو باتیں اُس علاقے کے باسی جانتے ہیں کوئی دوسرا شخص بیان نہیں کر سکتا۔ لہٰذا غیر مقامی افسانہ نگار اس دور میں فکری پہلو پر بات نہیں کر سکے۔ جبکہ دیگر حوالوں سے ثقافت کی ترجمانی یہاں کے اردو

افسانوں میں ملتی ہے۔ فکری پہلو کو پہلی مرتبہ تیسرے دور کے افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں اُبھارا اور روایات پر بات کی انسان ہمیشہ اپنی روایات پر قائم رہتا ہے اس بات سے قطع نظر کہ وہ اچھی ہیں یا بُری ان پر کار بند رہتا ہے ۔اگر ان روایات کو بُرا کہے تو وہ ان سے لڑنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ ہمارے افسانوں نے روایات کی اس پاسداری کو بھی برتا ہے ''ولور'' یا ''لبّ'' بلوچستان میں رہنے والے پشتون اور بلوچ قبائل کی رسم ہے جس پر صدیوں سے کار بند ہیں۔اس رسم کا تعلق شادی بیاہ سے ہے۔ پشتو میں اسے ''ولور'' اور بلوچی و براہوی میں ''لب'' کہتے ہیں۔اس رسم کے مطابق لڑکی کا رشتہ طے ہونے سے پہلے اس کے والدین کچھ شرائط رکھتے ہیں۔ان شرائط میں سے ایک شرط لڑکی کے بدلے رقم دینا ہے۔ یہ رقم ہر دور کے اعتبار سے مختلف رہتی ہے۔ یہ رسم قدیم معاشرے کے مخصوص حالات کی پیداکی ہوئی ہے اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ لڑکی کے والدین بچپن سے لے کر جوانی تک اپنی بچی کی پرورش کے اخراجات برداشت کرتے ہیں ایک دن اس نے بیاہ کر چلے جانا ہے اس شادی پر ہونے والے اخراجات کے لیے لڑکے والوں کی شرکت بھی لازمی ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں لڑکی والوں کی مدد کرنے کے لیے ولور یا لب لینے کی رسم کا آغاز ہوا تھا۔ ولور لینے کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ عموماً لڑکی کے والدین ولور کی تمام رقم لڑکی کے لیے زیورات، کپڑے اور دیگر ضروریات کی اشیاء پر صرف کرتے ہیں۔

اور ان اشیاء کی صورت میں رقم واپس لڑکے والوں کے ہاں چلی جاتی ہے۔ یوں لڑکی کے بدلے لین دین کو لب و ولور کہتے ہیں۔ یہ یہاں کی ثقافت کا فکری پہلو ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔اس میں تبدیلی یا ٹھہراؤ نظر نہیں آتا۔ اس پہلو کو افسانہ نگاروں نے خوب اُجاگر کیا۔ شہناز اپنے افسانے کا عنوان ہی '' ولور'' رکھتی ہیں۔اس افسانے میں کم سن لڑکی کی شادی اس کے باپ کے ہم عمر شخص سے اس لیے طے کی جاتی ہے کہ وہ ولور میں بھاری رقم دیتا ہے:

''صدیق خان نے آج پورے پچاس ہزار ولور دے دیا ہے اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ مانگی ہے۔'' [۲]

بہت سے افسانہ نگاروں نے میں کہانیوں میں اس رسم کو اُجاگر کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رسم ایک مضبوط روایت کے طور پر صدیوں سے چلی آرہی ہے لوگ اسے آباؤاجداد کی قائم کردہ رسم سمجھ کر اہم گردانتے ہیں۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ براہوی زبان کے مشہور شاعر و محقق نادر قمبرانی بھی اپنے غیر مطبوعہ افسانے ''حنابندی'' میں لب کا ذکر عمدگی سے کرتے ہیں:

''پھر کون چار ہزار روپے لب دے کر درمیان میں آن ٹپکا۔اور اس کو حقیر رقم کے عوض خرید لیا۔'' [۳]

تیسرے دور میں اس پہلو پر لکھنے والوں نے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔اس لیے آج بھی تحریروں میں اس رسم کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

افسانوں کے تینوں ادوار میں کہانیوں میں بیان کیے گئے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو ابتدائی دور کی تحریروں میں ثقافتی ماحول کی جھلک نظر نہیں آتی۔البتہ کہیں کہیں مذہبی رنگ ضرور نظر آتا ہے۔جس سے مسلم ثقافت کی نما ئندگی ہوتی ہے۔

بلوچستان کے اردو افسانوں کے نمونوں میں سیاسی مسائل کو قبائلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔یوسف عزیز مگسی کے افسانے ''تکمیل انسانیت'' اور ''بارش کا پہلا قطرہ'' خالصتاً سیاسی ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔جب کہ محمد حسین عنقا کا افسانہ ''کوہستان کا یاپلٹ قحط'' اس ماحول کی عکاسی کرتا ہے جو بلوچستان کی معاشرت کا مخصوص رنگ ہے ۔اولین افسانے ''ایک راز سربستہ کا انکشاف یا غیبی امداد'' کا ماحول اور کہانی کی فضا بلوچستان کی بجائے اس وقت کے کراچی کے پس منظر میں ہے جہاں اُن دنوں مصنف ایک مدرسہ میں تعلیم کی غرض سے گئے تھے یعنی آغاز افسانہ سے بلوچستانی ماحول کا سراغ نہیں ملتا۔اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ بلوچستان کا ابتدائی اردو افسانہ اپنے ماحول کے اعتبار سے یہاں کی فضاؤں سے اپنا رشتہ نہیں جوڑ سکا تھا۔

تقسیم کے بعد کے اردو افسانوں میں انسانی ماحول کی جھلک یہاں کی ثقافت کا ملا جلا رنگ لیے دکھائی دیتی ہے۔ جس دور کے افسانوں کی بات ہو رہی ہے اس وقت کہانیوں میں بھوک افلاس و بے سروسامانی کے ساتھ ساتھ مدتوں ایک ہی ماحول میں رہنے کے بعد ایک دم نئے ماحول سے شناسائی کا عکس ملتا ہے۔کیوں کہ یہ دور ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ادیب بھی اپنے آباؤ اجداد کا دیا ہوا ماحول ایک نئے رنگ میں نئی جگہ پر دیکھتا ہے۔تو اس میں جدیدیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔''سات رنگ اور ایک گیان''اور ''خمار زہر آلود''اس عہد کے ایک نئے ماحول کی ترجمان ہیں۔دور دوئم کے افسانہ نگاروں نے بھی بہت کم توجہ اس طرف دی۔ماحول میں ثقافتی رنگ کم ہونے کی ایک بڑی وجہ لوگوں کی نقل مکانی بھی ہے۔دیگر عوام الناس کی طرح ادیب بھی تقسیم کے عمل سے دوچار ہوا لکھنے والے بہت کم رہ گئے۔اس لیے جتنے لوگوں نے افسانے تحریر کیے وہ اس نئے ماحول کو ثقافتی رنگ میں بہت کم ڈھال سکے۔وہ دور سادگی کا حامل تھا۔اس میں بے جا آزادی کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔'' دوزخی'' میں صفیہ پنہاں ایسے ہی ماحول کی عکاسی کرتی ہیں:

''امی سینما کی اجازت نہیں دیتیں۔ میری سہیلیوں کو آوارہ گرد کہتی ہیں۔ سیر کو جانے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں بس میرے پاس بیٹھ کر کپڑے سیو اور کاڑھو'' ۴

اس دور کے افسانے قدامت سے جدیدیت کی طرف سفر کی ابتدا کر رہے تھے۔ اس لیے ان میں ثقافتی رنگ کم ہی نظر آیا۔ روایات صدیوں پر محیط ہوتی ہیں اور ثقافت میں جدت صدیوں بعد ہی آتی ہے یہ نئے پن کو فوری طور پر قبول نہیں کرتیں۔

تیسرا دور جو کہ ۱۹۷۲ء سے لے کر زمانہ حال کے اردو افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس دور کی تحریروں میں ثقافتی رنگ میں رنگا ہوا ماحول جا بجا نظر آتا ہے۔ پچھلے دو ادوار کے مقابلے میں یہ دور تبدیلیوں کے بعد ٹھہراؤ کی جانب آ چکا تھا۔ اس لیے لکھنے والوں نے بھی دیگر لوگوں کی طرح اس ٹھہراؤ کو قبول کیا۔ اور نئی تخلیقات فراہم کیں۔ یہاں کی ثقافت رنگا رنگی کی حامل ہے۔ جن میں بلوچی، براہوی، اور پشتون قبائل اکثریت میں ہیں۔ یہ تین مختلف بولیاں بولنے والے لوگ مختلف ماحول کے پروردہ ہیں۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے اس ملے جلے ثقافتی ماحول کو اپنے مخصوص انداز میں اپنی تحریروں میں برتا ہے۔ جس سے کئی صدیوں سے رائج شدہ لگا بندھا انداز تحریر ختم ہو گیا۔ اس دور میں بھی بالخصوص ۸۰ اور ۹۰ کی دہائی میں یہاں کے اکثر مقامی زبان بولنے والے افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں ثقافتی رنگ زیادہ ملتا ہے۔ ان میں آغا گل، طاہر محمد خان، فاروق سرور، افضل مراد، اور یعقوب شاہ غرشین وغیرہ کے افسانے بالخصوص ثقافت کا لبادہ اوڑھے بہترین ماحول کی جھلک دکھاتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن کے افسانے بھی بلوچستان کی مخصوص فضا میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے ہاں بھی بلوچستانی ماحول پورے آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا افسانہ کھمبا اور بلا عنوان خالص دیہی ماحول کی تصویر دکھاتے ہیں۔ غیر مطبوعہ افسانہ کھمبا میں بلوچستانی ماحول کی جھلک ملاحظہ ہو:

''یہاں رہن سہن کے انداز کی سادگی شروع میں تو بہت بھاتی لیکن مہمانی کے چند دنوں کے بعد جب مسلسل لسی، کرت، پیاز، بسکی، خٹول اور کبھی کبھی خشک روٹی کھانے کو ملتی تو میں سوچا کرتا تھا کہ میں وہ سب کچھ کروں گا جو میرے باپ دادا نہیں کر سکے۔'' ۵

ڈاکٹر صاحب نے کہانی میں یہاں کے قبائلیوں کی خوراک کا ذکر کر کے اسے ثقافت کے ہم رنگ کر دیا۔ تینوں ادوار کے افسانوں میں انسانی ماحول کا موازنہ کیا جائے تو دور سوئم یعنی ۱۹۷۲ء تا حال کے افسانوں میں بلوچستان کے مخصوص ثقافتی ماحول کے بے شمار نمونے ملیں گے۔ اس دور میں شہری ماحول، دیہی ماحول، مذہبی رجحانات وغیرہ کو ثقافت کے رنگ میں لپیٹ کر پیش کیا گیا۔ ابتدا میں تحریر کا یہ انداز سب کو بھانے لگا لیکن کثرت سے لکھنے کی وجہ سے

پسندیدگی میں کمی بھی آئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بلوچ، پشتون اور براہوی قبائل کے علاوہ دیگر زبانیں بولنے والے لوگ بھی صدیوں سے آباد ہیں۔جو یہاں کی نصف آبادی کہی جا سکتی ہے۔ان کی اپنی تہذیب و ثقافت ہے۔جس کے زیر اثر ان کا اپنا مخصوص ماحول ہے۔لہٰذا یہ بات سمجھنے کی ہے کہ یہاں پر افسانوں کا قاری صرف قبائلی نہیں بلکہ دیگر زبانیں بولنے والے بھی ہیں۔ہمیشہ وہی تحریر دوام حاصل کرتی ہے۔جو عوام و خواص میں کثرت سے پڑھی جائے اور مقبول بھی ہو۔جبکہ مخصوص ثقافت کے بارے میں تحریر کے قاری محدود تعداد میں ہوں گے۔اُس تحریر میں وہی لوگ دلچسپی لیں گے، جن سے خاص ہو۔یہاں بھی افسانوں کے تیسرے دور میں انسانوں کے ماحول کو تمام مقامی و غیر مقامی افسانہ نگاروں نے پیش کیا جس سے تحریر یکسانیت کا شکار ہو گئی.

ثقافت کے فکری پہلو کے حوالے سے تحریروں میں موضوعات کو دیکھا جائے تو کسی بھی تحریر میں موضوع کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔موضوع کے انتخاب کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ہمارے ارد گرد موجود ہر چیز افسانے کا موضوع ہو سکتا ہے۔لیکن افسانہ نگار کو ایک چیز کی پابندی کرنی ہوتی ہے کہ وہ جس موضوع کو اپنے افسانے کی بنیاد بنائے ہے اس کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو، تاکہ موضوع کے مطابق تحریر کو پھیلا سکے۔بلوچستان کے اردو افسانوں کے موضوعات کو ادوار کی ترتیب سے دیکھا جائے تو تینوں ادوار میں افسانے کے موضوعات مختلف رہے ہیں۔تقسیم سے پہلے ہندو مسلم اکٹھے رہتے تھے، بلوچستان میں بھی ہندو اکثریت میں آباد تھے۔دور اول کے افسانوں میں ہندو مسلم ثقافت مشترک موضوع کے طور پر تحریروں کا حصہ رہا۔لیکن تناسب میں مسلم ثقافت کی نمائندگی زیادہ ہے بہ نسبت ہندو ثقافت کے، محمد عمر بلوچ کے افسانے ''ایک راز سربستہ کا انکشاف یا غیبی امداد''میں نااہل مسلمانوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس میں مذہب کو اولیت دی گئی ہے۔اس دور کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر اصلاحی رنگ میں نظر آتے ہیں لیکن ان میں مخفی طور پر قبائلیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ہندو ثقافت کے کچھ افسانے بھی پاسبان کے ابتدائی دور کے اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔دیوالی، دیوتا، سہاگ اور دُکھی جوانیاں میں ہندو ثقافت کو موضوع بنایا گیا۔مثلاً اسی اخبار میں شائع ایک افسانہ ہندوؤں کی مذہبی تہوار دیوالی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا موضوع اور عنوان دونوں دیوالی ہیں:

> ''شہر کے بڑے مندر میں پھولوں سے لدی ہوئی لکشمی دیوی کی مورتی قمقموں کی روشنی میں جگمگا رہی تھی۔ چرنوں میں پجاریوں کے چڑھائے ہوئے پھول اور پرشاد کی تھالیں رکھی ہوئی تھیں... اس روز دیوالی تھی۔'' [۶]

پہلے دور کے افسانوں میں بلوچستان کے مشہور شاعر و صحافی محمد حسین عنقا کا افسانہ کوہستان کا یا پلٹ قحط کا موضوع یہاں کی تہذیب و معاشرت کے عین مطابق ہے ۔اس افسانے میں انھوں نے بلوچستان کے پہاڑ ،جنگل، جھونپڑی، دہقان وغیرہ پر کہانی کی بنیاد کھڑی کی ہے۔اس دور کے افسانوں میں یہ افسانہ خالصتاً بلوچستانی ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے۔وہ یہاں کے پہلے لکھنے والے ہیں جن کے ہاں تہذیبی رچاؤ تناسب کے ساتھ موجود ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد حسین عنقا اُس دور میں کوئٹہ اور مچھ میں سکونت پذیر تھے اور کبھی کبھار کراچی چلے جاتے۔یہاں کے مقامی ہونے کے باعث انہیں موضوع کے انتخاب میں مشکل پیش نہیں آئی۔ تقسیم سے پہلے افسانہ نگار اصلاحی موضوعات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور انھی پر کہانی کا تانا بانا بُنا جاتا تھا۔ تقسیم کے بعد کے حالات و واقعات کچھ اور تھے ۔۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے اردو افسانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دور میں ثقافت کے اعتبار سے کہانیوں کے موضوعات بہت بعد میں دیکھنے کو آئے ، تقسیم کے فوراً بعد ایک مدت تک یہاں کے لکھنے والوں نے بھی تقسیم کی مشکلات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی جو کہ ثقافتی رنگ سے عاری تھیں۔ماہنامہ رہبر نسواں میں آزادی کو موضوع بناتے ہوئے افسانہ ''آزادی کی سالگرہ'' تحریر کیا گیا:

> ''بنو آج بھی پندرہ اگست ہے، آج ہمیں پاکستان ملے ہوئے پورے دو سال ہو گئے اور آج ہم اس کی دوسری سالگرہ منا رہے ہیں۔'' [۷]

ایسے موضوعات اس دور میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ادیب جو کچھ اپنے ارد گرد دیکھتا ہے آسانی سے ضبط تحریر میں لا سکتا ہے۔ تقسیم کے وقت تحریر کے موضوعات جو بھی رہے ہوں کہانی کے بیان میں تہذیبی رکھ رکھاو کا خیال موجود ہے کرداروں کا طرز تخاطب انتہائی مہذب ہے۔عزت و تکریم بھی معاشرتی قدریں ہیں۔جن کی جڑیں ثقافت میں پیوست ہیں۔

۶۰ء کی دہائی میں بیگم خورشید مرزا کے افسانے آپی، رواج وغیرہ موضوعات کے اعتبار سے یہاں کے ثقافتی رنگو ں سے ہم آہنگ ہیں۔ ثقافتی موضوعات کی جھلک بھی تیسرے دور میں نمایاں ہے۔اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک وجہ افسانوں کا کثرت سے تحریر ہونا ہے۔ جتنی کثرت سے کہانیاں لکھی جائیں گی۔ان کے لیے موضوعات بھی اُس قدر چا ہئیں اس مقصد کے پیش نظر افسانہ نگار مختلف تجربات کرتے ہیں۔ مختلف چیزوں کو موضوع بناتے ہیں۔دوسری بڑی وجہ ثقافت میں گہرائی و گیرائی کا ہونا ہے۔ کہانیوں میں ثقافت کو بطور موضوع منتخب کرنے سے افسانہ نگاروں کو بہت سے نئے موضوعات مل جاتے ہیں۔ کہیں وہ رہن سہن پر کہانی کی بنیاد کھڑی کرتا ہے تو کہیں رسم و رواج پر، کہیں شدید موسم کو موضوع بناتا ہے تو کہیں جغرافیائی عوامل پہاڑوں، جنگل، صحرا و بیابانوں پر افسانے لکھتا ہے۔ لہٰذا اس دور کے

لکھنے والوں نے ایسا ہی کیا اور ثقافت کے تمام پہلوؤں پر کہانیاں تحریر کر ڈالیں۔ ان تمام موضوعات پر افسانے موجود ہیں۔ بلوچستان کے کچھ علاقوں میں موسم کی شدت بہت زیادہ ہے۔ جبکہ کچھ علاقے شدید گرم ہوتے ہیں۔ موسم گرم ہونے پر خانہ بدوش نقل مکانی کر کے سرد علاقوں کا رُخ کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد سرد سے گرم علاقوں کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ خانہ بدوشوں کی زندگی آسائشوں سے عاری ہے۔ موسم کی شدت سے متاثر ہونا ایک قدرتی عمل ہے طاہر محمد خان ''پانی کا جبر'' میں ایک خانہ بدوش خاندان کا ذکر کرتے ہیں۔ جو بارش کے سبب ندی کا پانی چڑھ جانے سے دوسرے پار اپنی بیمار بیوی کو نہیں لے جا سکتا تھا، پہاڑوں پر سیر کے لیے آنے والوں سے کہتا ہے۔ ہمارے گھر پر بیماری ہے ہم بولا کہ جلدی اُس طرف جائے ادھر آبادی ہے اور عورت لوگ طبیب ہے عورت کا تکلیف کو جانتا ہے۔ رضائی کی باتوں سے پتا چلتا ہے اس کی بیوی بیمار ہے دن بھر رضائی اپنے گدان کے اندر جاتا رہا اور باہر آتا رہا اس کے بچے ماں کو تکلیف میں دیکھ کر چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ اس قسم کے موضوعات پر بے شمار افسانے تحریر کیے گئے۔ بلوچستان کے کچھ خطے بارشیں نہ ہونے سے قحط سالی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس قحط سالی سے انسان اور جانور دونوں ہی متاثر ہوتے ہیں۔ طویل خشک سالی کے بعد جب وہاں بارش ہو جاتی ہے تو ان کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ ناکافی سہولیات کے پیش نظر یہ لوگ خود کو موسم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ موت کے منہ میں بھی چلے جاتے ہیں۔ عبدالغفار لگجی، ''قحط سالی'' کے عنوان سے افسانہ تحریر کرتے ہیں جس میں خشک سالی، موسم کے شدائد کو خانہ بدوشوں کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں۔ کنگزار کو بارش نے ہی مارا ہے اس کو کوئی پوشاک پہناد و گنجی نے کہا ہمارے پاس کوئی کپڑا ہی نہیں۔ اب یخ بستہ ہوا اور بھی تیز تر ہو کر چلنے لگی۔ سخت سردی تھی اور اس سے ہر ایک آدمی کانپ رہا تھا۔ باران نے فریاد کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے منہ کالے ہو گئے کنگزار خدا کو پیارا ہو گیا ہے۔ دور سوئم کے بے شمار افسانوں میں موسم کے حوالے سے کہانیاں موجود ہیں۔ بارش کے علاوہ برف باری کو بھی کہانیوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس موسم میں کچے مکانات کے گرنے کا خدشہ، کھانے پینے کی اشیاء کی قلیت اور گرم کپڑوں کی عدم دستیابی جیسے مسائل کو مقامی افسانہ نگاروں نے کہانیوں میں برتا ہے۔ موسموں کے بیان کے علاوہ یہاں کے قبائل کے رسوم پر بھی افسانے تحریر کیے گئے ہیں۔ لب وولور کے علاوہ اُن خواتین پر بھی افسانے تحریر کیے گئے ہیں۔ جو مختلف رسوم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ عرفان احمد بیگ ''ببول'' میں ایسی ہی لڑکیوں کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ جو جنگ میں صلح ہونے کی صورت میں مخالفین کو دی جاتی تھیں۔

خون بہا میں شیر خوار لڑکیوں کی بجائے سات سال یا اس سے اوپر کی عمر کی لڑکیاں دی جاتی ہیں۔ افسانے میں یہ پہلو واضح کیا گیا ہے کہ بچیاں سات سال سے کم عمر کی تھیں اس لیے ان کے دانت اوزاروں سے خود ہی کھینچ کہ نکالے جاتے ہیں۔ تاکہ یہ بچیاں اُسی عمر کی لگیں، جس کا تقاضا فیصلے میں کیا گیا تھا:

> ''آپ ابھی سے اپنے خاندان اپنے رشتے داروں میں سے سات سال کی عمر تک یا اس سے بڑی دو کنواری لڑکیوں کی قربانی کے لیے تیار کریں... کسی بچی کی بھیانک چیخیں گونجیں... یہ کون چیخ رہی تھی اس نے پوچھا تمھارے لیے قربانی پر دی جانے والی بانو تھی... کہاں سے لاتے دو لڑکیاں جن کی عمریں سات سال سے اوپر ہوں.... اس لیے بانو کے دانت نکال دیئے گئے ہیں۔''[۸]

اس قسم کے بہت سے افسانے دور سوئم میں لکھے گئے۔ جن میں عورتوں اور بچیوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ انھیں اُن بھیانک فیصلوں کی بھینٹ چڑھایا گیا جن سے اُن کا دور تک کا واسط نہیں تھا۔ یہ تصویریں یہاں کی دیہی معاشرت کی سچی تصویریں ہیں۔ جنہیں افسانہ نگاروں نے موضوع بنایا۔ مرد ہر دور میں طاقتور رہا ہے جبکہ عورت کمزور، ان افسانوں کی کہانیوں سے بات سچ ثابت ہوتی ہے۔

کہانیوں میں عنوان اہمیت کا حامل ہے۔ اکثر عنوان کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں لکھنے والے نے کس موضوع پر بات کی ہے۔ موضوع اور عنوان کے ربط سے کہانی تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ عنوان کو دلچسپ ہونا چاہیئے۔ جسے سن کر قاری کا دل مطالعہ کرنے کو چاہے اسی مقصد کو لے کر افسانہ نگار اپنے عہد کے حالات و واقعات کے مطابق کہانیوں کو نام دیتے ہیں۔ بلوچستان کے اردو افسانوں کے عنوانات کا ثقافت کے پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو ابتدائی تحریروں میں ایسا کوئی قابل ذکر افسانہ نہیں ملتا کہ جس کا عنوان بالواسطہ طور پر ثقافت سے جُڑ سکے ۔ دور اول میں لکھے گئے اردو افسانوں کے عنوانات اس وقت کے مخصوص حالات کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں۔ لیکن ثقافت سے ان کا ربط نہیں ملتا۔ کوہستان کا یا پلٹ قحط، گوشت کا ٹکڑا، بھوکی، بھکارن، مصیبت زدہ، افلاس وغیرہ ابتدائی دور کے افسانوں کے عنوانات ہیں۔ جو ثقافت کی نمائندگی کرنے والے عنوانات نہیں کہے جا سکتے ۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے عہد میں لکھے جانے والے افسانے تغیر پزیر حالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس دور کے عنوانات سحر ہونے تک، منزلیں، یہ دنیا والے، بیتے لمحے اور میں کبھی نہیں بھولوں گا وغیرہ تقسیم کے بعد کے المیے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس دور کے لکھنے والوں کا رجحان ثقافت جیسے وسیع کینوس کی طرف نہیں گیا۔ جس میں بے شمار عنوانات ہر پہلو کی تہہ میں پوشیدہ ہیں۔ ۱۹۷۲ کے بعد لکھے جانے والے افسانوں میں ثقافتی عوامل کی بھرمار ہے۔ یہ اس دور کا انوکھا تجربہ تھا کہ ادب میں بطور عنوان ان ناموں کو روشناس کروایا جائے جو قاری کے لیے نامانوس نہیں ہیں۔ اسی تجربے کو

لے کر یہاں کے مقامی زبانوں سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں نے بالخصوص ثقافت سے ہم آہنگ ناموں کو افسانے کا عنوان بنادیا۔اس دور کے نمائندہ افسانے جو ثقافتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ان میں بولان کی بیٹی، کھلّی والا ،ولور، گور یچ،چبر، شلمبے تازی شلمبے،طالب ،کورہ کئی، ھُلی، چلتن اور زرغون، جرگہ، غیرتی وغیرہ شامل ہیں۔جب کہ افسانوی مجموعے کا نام گور یچ رکھا گیا ہے۔جس کے معنی یخ بستہ ہوا' کے ہیں۔کچھ افسانے ایسے بھی ہیں جن کے عنوانات براہ راست ثقافت سے مطابقت نہیں رکھتے لیکن پڑھنے کے بعد وہ افسانے ثقافت کے ذیل میں آجاتے ہیں ان کی کہانی ثقافت کے کسی نہ کسی پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔عنوانات میں ثقافتی عوامل کو متعارف کرانا ایک اچھا تجربہ ہے ۔جس کے ذریعے افسانہ پہلے لفظ سے ہی یہاں کی ثقافت کے فکری یا عملی پہلو سے جڑ کر اپنے منشا کی وضاحت کرتا ہے۔

تینوں ادوار کے افسانوں میں ثقافتی رجحانات کا جائزہ بتاتا ہے کہ ثقافتی رجحانات کہیں نہ کہیں کم یا زیادہ کی صورت میں کہانیوں میں موجود ہیں۔ابتدائی دور کے دستیاب افسانوں میں شعوری طور پر ثقافتی رجحان برتا گیا ہے ۔تقسیم سے لے کر ۱۹۷۱ءکے افسانوں کی فضا بھی تقریباً ویسی ہی رہی جیسی کہ ابتدائی دور کی تھی۔لکھنے والوں کا رجحان دین و دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اصلاحی بھی رہا۔عوام میں جوش و جذبہ اور کام کرنے کی لگن پیدا کرنے کا رجحان زیادہ تھا۔خادم مرزا کے افسانوی مجموعے میں کوئی افسانہ خالصتاً ثقافت کی نمائندگی نہیں کرتا لیکن انھوں نے کہانیوں میں ریگ زار، پہاڑ، گاؤں، گلاب کے پھول، چلم ،لالٹین اور درخت وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انھوں نے کہانی میں چلتے چلتے ان اشیاء کا ذکر کر دیا ہے جن کا ثقافت کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔سید خلیل احمد کا افسانوی مجموعہ خمار زہر آلود بھی اس دور کا نمائندہ افسانہ ہے جس میں براہ راست بلوچستان یا یہاں کی ثقافت کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔لیکن انھوں نے یہ مجموعہ یہیں پر رہتے ہوئے تحریر کیا ہے۔جو کیفیات انھوں نے بیان کیں چاہے وہ برف باری کی ہوں یا بارش کی پہاڑ ہوں یا جنگلات کا ذکر،ان میں کوئٹہ کی کہانی پوشیدہ ہے۔یہ تمام اشیاء ثقافت کے ذیل میں آتی ہیں۔افسانہ نگار کا براہ راست رجحان ثقافت کی طرف نہیں ہے۔۱۹۷۱ءکے بعد لکھے جانے والے افسانوں میں ثقافتی رجحان پایا جاتا ہے اس دہائی میں ثقافتی رنگ کو اردو افسانوں میں جگہ ملنی شروع ہوئی اس کی تھوڑی بہت جھلک گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے مجلہ ''بولان''(۷۷۔۷۶)میں عزیز محمد بگٹی کے افسانہ ''سکوت ناتمام'' میں ملتی ہے۔جس میں دیہی مناظر کو پیش کیا گیا ہے(۷۰تا۹۰ ) کی دہائی میں بہت سے ایسے افسانے ملتے ہیں جن میں افسانہ نگاروں نے شعوری کوشش کے ساتھ ثقافت پر افسانے لکھے۔ڈاکٹر فردوس انور قاضی کے افسانوی مجموعے ''آ

خری ٹرین'' میں موجود کہانیوں کو کلی طور پر ثقافتی رجحان کا حامل تو نہیں کہہ سکتے البتہ کہانی کہتے کہتے انھوں نے درخت لالٹین، گاؤں، برقعہ، کھیت، یخ ہوا، برف اور بانسری جیسے الفاظ کا ذکر کیا ہے۔

گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ کے مجلہ ''ریحان'' (۷۹-۸۰) کے افسانوں میں بھی کہانی کہتے کہتے کچھ ایسے الفاظ ملتے ہیں۔ جن سے انداز ہوتا ہے کہ افسانوں کے دور سوئم میں لکھنے والے رجحان کی تبدیلی کی طرف آ رہے ہیں ۔اسی دور کے افسانوں میں ثقافتی رجحان کو ڈاکٹر ضیاءالرحمٰن نے غیر مطبوعہ افسانے ''بلا عنوان'' میں بہت خوبصورتی سے برتا ہے۔اس افسانے میں انھوں نے خالصتاً بلوچی ماحول کی عکاسی کی ہے اور کہانی میں بلوچی کشیدہ کاری کے نام تک لکھ کر افسانے کو ثقافت کے ہم رنگ کر دیا۔

> '' گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اسے کشیدہ کاری کے بہت سے نمونوں پر عبور حاصل ہو گیا تھا ۔لیکن پنچ کو ڈک، پیک دتک ،تروپہ،تل ملو، جالار،جوک ،چنگ وچوٹ،دوسوتی ،ڈگار دوچ،زرطو،سہ کو ڈک، شیراز شیتگی،قلاتی ،قندھاری نمونہ کانٹلو، گردو، گل ایرکش،لوپو ،ماہی پشت اور موسم اس کے پسندیدہ ڈیزائن تھے۔ لیکن اسے توف، چانپل، چپی دانہ، چہاچمپ اور زنجیر جیسے مشکل ٹانکوں پر بھی عبور حاصل تھا۔'' ۹

اس طویل اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلوچ خواتین اپنے لباس کو کس طرح ثقافت کے طابع رکھتی ہیں۔ کشیدہ کاری کے ذیل میں ان کی مہارت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے یہ ان کی زندگی کے شب و روز کے معمولات کا حصہ ہے۔اس نکتے کو ڈاکٹر صاحب نے افسانے میں نمایاں کر کے ثقافت کے ہم آہنگ کر دیا۔اس دور کے بہت سے افسانے براہ راست اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔اور کچھ افسانے بالواسطہ ثقافتی رجحان کے حامل ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ رجحان مزید کتنی دہائیوں تک رہتا ہے ؟آیا نئے لکھنے والے اس جمود کو توڑ دیں گے یا اس سفر کو جاری رکھتے ہوئے رجحان میں تبدیلی کی جسارت نہیں کریں گے۔

ماجرہ طرازی میں بہت سے ایسے زاویوں سے افسانے تحریر کیے گئے ہیں۔ جن میں ثقافتی پہلو کسی نہ کسی طور پنہاں ہوتا ہے معاشی کروٹیں، جھگڑے اور جنگیں، دیہاتوں اور شہروں کی پیشکش، دیومالائی عناصر کی کارفرمائی، نفسیاتی و جنسی زاویہ نگاہ، سیاسی فکر، رویے اور عصریت وغیرہ وہ پہلو ہیں جن کو تینوں ادوار میں ثقافت کے فکری پہلو کے طور پر کہانیوں میں برتا گیا۔ معاشی اعتبار سے بھوک وافلاس، خشک سالی کے باعث خوراک کی کمی وغیرہ کو یہاں کے لکھنے والوں نے کہانیوں میں جگہ دی ہے۔ دیہی و شہری زندگی کی تصویریں بھی ادوار کے اعتبار سے مختلف انداز لیے ہوئے موجود ہیں۔ دیہی زندگی میں کم سہولیات کے پیش نظر محرومیوں کو کرداروں کے زریعے عمدگی سے اُجاگر کیا ہے

۔ جبکہ شہری زندگی کی آسودگیاں بھی ثقافتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ دیومالائی عناصر کے حوالے سے ابتدائی دور میں تو کوئی قابل ذکر افسانہ نہیں ملتا۔ تیسرے دور میں ان عناصر کو کہانیوں کا حصہ بنایا گیا ہے۔ غیر محسوس اور غیر مرئی مخلوقات فرشتے، دیو، پری اور شیطان تو دنیا بھر کے ادب میں ہیں۔ لہٰذا یہاں کے اردو افسانوں میں بھی ان عناصر کی تھوڑی بہت جھلک نظر آتی ہے، ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کے غیر مطبوعہ افسانہ '' مماءمم'' میں دیومالائی عناصر کا ذکر پہلی مرتبہ ملتا ہے۔

'' مم اپنے شکار کے تلوے چاٹ چاٹ کر اس کا تمام خون پی چکی تھی تلاش کرنے والے گروہ نے مم کو تو ہلاک کر دیا لیکن وہ اس افسر کو نہ بچا سکے۔'' ۱۰

ڈاکٹر صاحب کے علاوہ یعقوب شاہ غرشین '' کابوس'' میں دیومالائی عناصر کی مدد سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جب کہ آغا گل کے افسانے ''ڈریکولا'' اور '' گوانکو'' اسی نکتے سے متعلق ہیں ان کا ایک اور افسانہ وادی قاف انگریزی افسانے سے ماخوذ ہے جس میں دیومالائی عناصر پر کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ گوانکو میں وہ ان غیر مرئی عناصر کے ناموں کا سہارا لے کر کہانی تشکیل دیتے ہیں۔

جب کہ انھی ناموں کا تذکرہ ڈاکٹر ضیاالرحمٰن گوانکو کی اشاعت سے دس سال پہلے اپنے غیر مطبوعہ افسانے ''مماممم'' میں کر چکے ہیں۔ ذیل میں وہ نام پیش کیے جا رہے ہیں۔ جو افسانے میں دیومالائی تاثر دینے کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کو ان ناموں سے متعلق معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔

۱: اُچ نہار۔ اونٹ کی شکل کی مخلوق جو انسانوں کو کھاتی ہے۔

۲: بلسہ ۔ ایسی بڑھیا جو سر سے جوئیں صاف کرنے کی درخواست کرتی ہے اور انکار کرنے والوں کو مار دیتی ہے۔

۳: پیرہ ۔ بوڑھا جو مسافروں سے مدد چاہتا ہے اور پھر تین لجلجی ٹانگوں سے اسے قابو کر لیتا ہے ۔

۴: جاتو ۔ ایک چڑیل نما مخلوق جو نہتا مریض اور زچہ کا دل نکال کر کھا لیتی ہے۔

۵: جماعتی ۔ درخت پر بیٹھی مادہ جن، جو زمین پر خالی رکابی رکھ کر مدد چاہتی ہے اور انکار کرنے والے کو نقصان پہنچاتی ہے۔

۶: چک بر ۔ وہ مخلوق جس کی شکل پرندے جیسی اور قد گدھے جیسا ہوتا ہے۔

۷: گوانکو ۔ رات کو جو دروازے پر آواز دیتا ہے۔ جو جواب دے گونگا ہو جاتا ہے۔

۸: ممّلی۔ بڑے بڑے بالوں والی بدبودار مخلوق جو جوڑے کی صورت میں رہتی ہے، انسان کسی ایک کو مار دے تو دوسرا ساتھی انتقام ضرور لیتا ہے۔

۹: مملہ۔ اس مخلوق کا نر عورت کو اور مادہ، مرد کو دروازے پر آواز دیتی ہے۔ جو باہر نکلے اسے غار میں لے جاتی ہے اور اس کے تلوؤں سے خون چاٹتی ہے تاکہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے اسی حالت میں انسان کی موت واقع ہو جا تی ہے۔

یہ مافوق الفطرت عناصر صرف براہوی لوگ ادب ہی سے مخصوص ہیں۔ جنھیں منطقی تحلیل اور تعقلاتی تحلیل کی ان جدید کسوٹیوں پر پرکھا جائے تو یہ اس زبان اور ثقافت کی انفرادیت، اجتماعیت، قبائلیت اور افکار وافعال کی و ضاحت بھی کرتی ہیں اور اسے اس مقام پر کھڑا کر دیتی ہیں جہاں سائنس کے تخلیقی عمل کو پہنچنے میں بہت دیر لگے گی۔ دور سوئم کے اردو افسانوں میں ان عناصر کا تذکرہ یہاں کے افسانہ نگاروں کی گہری بصیرت کا نتیجہ ہے۔

بلوچستان میں قبائلی نظام کی بدولت جنگیں پشت در پشت چلتی ہیں۔ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کو ہی بہادری تصور کی جاتی ہے اگر ایک فریق جنگوں میں حصہ نہیں لینا چاہتا تو اُسے بزدل اور غیرت کے منافی قرار دیا جاتا ہے۔ بلوچ، پشتون قبائل میں جب بچہ ہوش سنبھالتا ہے تو اسے اسلحہ سے شناسائی دلائی جاتی ہے۔ اور اس کا استعمال بھی سکھاتے ہیں، اس طرح وہ اپنے بڑوں میں رہ کر جدّی پشتی چلنے والی جنگوں اور جھگڑوں سے بھی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہاں کے افسانہ نگاروں نے تیسرے دور میں پہلے دو ادوار کی نسبت زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ طاہر محمد خان ''ذود پشیمان'' میں جرگہ کے نام سے ایک افسانے میں ایسے ہی ایک قبائلی جھگڑے کا ذکر کرتے ہیں جو دو قبائل کے درمیان برسوں جاری رہتی ہے۔ جس میں بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں۔

اسی طرح '' طلب ہم عنان'' میں یعقوب شاہ غرشین قبائلی دشمنی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لڑائی بیان کرتے ہیں۔ ان قبائلی جھگڑوں کی شروعات مردوں کی طرف سے ہوتی ہے لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان جنگوں کا اختتام عورتوں پر ہوتا ہے۔ صلح کے بدلے میں دی جانے والی خواتین مخالفین کے گھروں میں جا کر بدترین زندگی گزارتی ہیں۔ عرفان احمد بیگ اس رسم کو افسانے میں بیان کرتے ہیں:

> '' اسے معلوم تھا کہ ایسے ہرجانے میں دی گئی لڑکیوں کی حالت زندگی بھر جانوروں سے بدتر رہتی ہے۔''[11]

ان تمام بھیانک پہلوؤں کے باجود لوگ ان جھگڑوں کو اپنی روایات قرار دیتے ہیں۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہیں۔

ہمارے ہاں نیاادب حالات وواقعات کے تحت وجود میں آیا یا جن تبدیلیوں پر اس کا ڈھانچہ قائم ہے۔ وہ تمام تر مغربی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد مغرب میں یہ خیالات عام ہو گئے تھے کہ زندگی کی جتنی مہلت ہے اسے بے باکی اور آزادی سے بسر کیا جائے۔ انھی خیالات کے نتیجے میں جنسیات کا مسئلہ ایک دم اہمیت کا حامل ہو گیا۔ مغربی ناقدین نے جنس کو مقدس فریضہ تک کہا ہے۔ شیفلڈ کے بہ قول، جنسیات کے معاملے میں خاموشی معصومیت نہیں بلکہ جرم ہے ۔اور یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ ہم اس خاموشی کو جلداز جلد ختم کر دیں۔ لہٰذا شیفلڈ کے خیالات کو لے کر مغربی ادب پاروں میں جنس کے حوالے سے جابجانمونے ملتے ہیں۔ مغربی مصنفین کے بعد ہمارے ہاں بھی ہر صنف میں جنسیات کو برتا گیا۔ نظم ہو یا نثر جنسیات کو بہ طور موضوع ہر دور میں تخلیقات کا حصہ بنایا گیا۔ بہ قول ڈاکٹر ساجد امجد کے ، جنس کا موضوع ہر دور میں اور ہر زبان کے ادب میں موجود ہے۔ افسانوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ارد گرد سے سچی کہانیاں اور واقعات لیے جاتے ہیں تاکہ پڑھنے والا اسے حقیقی سمجھ کے کہانی کے سحر میں گرفتار ہو جائے۔ ہماری یہ زندگی تجربات، جذبات واحساسات کا نام ہے جنس بھی اس زندگی کا ایک پہلو ہے۔ اکثر لکھنے والوں نے اس پہلو کو بھی کہانیوں میں شامل رکھا۔ کسی نے بہت کھل کر بات کی تو کسی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں حقیقت پسندی سے افسانے کا دامن بھرا ہے۔ افسانوں کے پہلے دور میں جنسیت کے نکات نظر نہیں آتے۔ دوسرے دور کے افسانوں میں تجرباتی طور پر اس پہلو کو روشناس کرایا گیا ہے ۔ تیسرے دور میں جنسی موضوعات پر افسانے ملتے ہیں ۔آخری آنسو، میرے زخم کہتے ہیں۔ ذود پشیمان جیسے افسانوی مجموعوں میں چند افسانے اس پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

یہاں کے اردو افسانوں میں پچھلے دو ادوار کے مقابلے میں دور سوئم میں ثقافت کے مختلف پہلو بہ طور موضوع مستعمل رہے ۔ لہٰذا ثقافت کے بیان میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے لازم ہے کہ کردار یہاں کے مقامی ہوں۔ یہاں کے افسانوں میں زنانہ اور مردانہ کرداروں کے نام بہت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں۔ مردانہ کرداروں کے ناموں میں بالاچ ،بچل ، بیبرگ ،بیزن ،چیر ،دراخان، دودو، شامیر ،شاہ ولی ،شنک، شیر باز ،ماما خیرو، میر گل، نبو، نود، دینو، نیازو، ولی جان، زرک، رضائی، گل خان، کنگزار، گل خان نصیر اہم ہیں۔ جب کہ علاقائی ادب کے زنانہ کرداروں کو بھی یہاں کے افسانوں کے کرداروں میں ڈھالا گیا۔ ان میں انار گل، بریشنا، بیگی، دلوتی، زباد، سازو،

صابرہ، شانو، بانو، نازو، گل بانو، گل جان، مائی چناں، نوری، شاہ تاج اور شاری شامل ہیں۔ ان کرداروں کی موجودگی سے یہاں کی کہانیوں پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

ناول کے مقابلہ میں افسانہ وہ صنف ہے۔ جس میں اختصار کے ساتھ زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ ناول اپنی طوالت کے باوجود ایک ہی موضوع کو ابتدا سے اختتام تک لے کر چلتا ہے۔ ثقافت کے ذیل میں بھی اردو افسانوں نے بہت سے پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے رکھا۔ ثقافت جیسے عمیق موضوع پر یہاں کے لکھنے والوں نے بے انتہا افسانے تحریر کیے۔ ثقافتی محرکات تینوں ادوار میں تحریروں کا حصہ رہے ہیں۔ ان محرکات کی تشکیل سے اردو افسانے کا دامن وسیع ہوا۔ ایک ہی ڈگر پر چلنے والے افسانہ نگاروں کو جدیدیت پر توجہ کرنے کا موقع ملا۔ پہلے دور کے اردو افسانے جو کہ قیام پاکستان تک کی افسانہ نگاری پر مشتمل ہیں۔ ان میں ثقافتی محرکات کی تشکیل کم ہے ۔ چاہے افسانوں میں انسانوں کے ماحول کی تشکیل ہے۔ یا افسانوں کے موضوعات کی، عنوانات کا انتخاب ہے۔ یا ثقافتی رجحانات کی تشکیل یا کہانی میں ثقافت کے مختلف پہلوؤں کا بیان، ان تمام کی تھوڑی سی جھلک ابتدائی تحریروں میں نظر آئی، اولین اردو افسانہ ایک راز سربستہ کا انکشاف یا غیبی امداد میں افسانہ نگار یہاں کے جغرافیہ کی جھلک غیر محسوس طریقے سے کہانی میں دکھاتا ہے، افسانہ کا تاثر یہی ہے کہ وہ صبح کا منظر بیان کر رہے ہیں۔ لیکن درپردہ وہ یہاں کے جنگل ،ان میں پائے جانے والے جانوروں، جنگل کے ساتھ ہی کنواں (کہ جس کا تعلق یہاں کی معاشرت کے ساتھ گہرا ہے )۔ان تمام ثقافتی محرکات کو انتہائی خوبصورتی سے کہانی کا حصہ بناتے ہیں۔ دوسرے دور کے اردو افسانوں میں، جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء پر محیط ہے ثقافتی محرکات کی تشکیل ابتدائی دور سے کچھ زیادہ ہے۔ اس میں عنوانات و موضوعات کلیتاً ثقافتی تو نہیں لیکن دیگر نکات کی جھلک ضرور موجود ہے۔ اُس دور کے افسانوں میں دیہی و شہری زندگی کی پیش کش کے ساتھ ساتھ نفسیاتی و جنسی زاویہ نگاہ سے بھی افسانہ نگاری کر کے ترقی پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ دور دوئم کی تحریروں میں معاشی کروٹوں کی تشکیل بہت زیادہ ہے۔ ایسے افسانے اس دور میں پیدا ہونے والی محرومیوں کا ازالہ کرتے ہیں۔ اس دور میں تہذیبی رچاؤ، مختلف انداز میں موجود ہے۔ ثقافت سے جڑی اشیاء کو کرداروں کے ساتھ باہم ملا کر کہانیاں تحریر کی گئیں۔ مثلاً برقع پردہ پوشی کے لیے استعمال ہوتا ہے یہاں کی خواتین برقع پہنے بغیر گھروں سے نہیں نکلتیں، پردہ پوشی یہاں کے قبائل میں لازم جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا برقع کا تعلق یہاں کی ثقافت سے گہرا ہے۔ دوسرے دور کے افسانوں میں کردار کو برقع استعمال کرتے دکھایا گیا ہے جس سے اس بات کی تفہیم ہو جاتی ہے کہ دور دوئم کے افسانوں میں ثقافتی محرکات کی تشکیل پہلے دور سے زیادہ ہے۔ بیگم خورشید مرزا "آپی" میں پردہ پوشی کے حوالے سے برقعے کا ذکر یوں کرتی ہیں:

" اتنے میں نہال کی والدہ اندر کمرے میں آئیں اور برقعہ اُتارتے اُتارتے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں۔" ۱۲

کہانیوں میں برقع کا برملا ذکر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس دور میں تمام خواتین اس کا استعمال کرتی تھیں اس کا تحریروں میں آنا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ دور سوئم ثقافتی محرکات کی تشکیل کے حوالے سے پہلے دو ادوار سے بازی لے جاتا ہے۔ اس دور کی کہانیوں میں شعوری طور پر ثقافتی محرکات کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ دور سوئم کے افسانوں میں عنوانات بھی ثقافت سے مطابقت رکھتے ہیں اور ماحول بھی خالصتاً ثقافتی رنگ لئے ہوئے ہے اس دور میں دیومالائی عناصر کا افسانوں میں لاکر نیا تجربہ بھی کیا گیا جو کہ دیگر دو ادوار میں نظر نہیں آیا۔ یہ اسی دور کی دریافت ہے۔ تحریروں میں عموماً تنازعات کے زمرے میں ساس اور بہو کے جھگڑے ہی بیان کیے جاتے ہیں لیکن جب سے ثقافت کے متنوع موضوعات تحریروں کا حصہ بنتے گئے تب سے گھریلو تنازعات کی جگہ قبائلی جنگوں اور جھگڑوں نے لے لی، لہٰذا دور سوئم کو یہاں کے ادوار افسانوں کے حوالے سے ثقافتی محرکات کی تشکیل کا منبع قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال ایک خانہ بدوش قبائلی کا خیمہ ہے۔ جس کی منظر کشی افسانہ نگار نے اس خوبی سے کی ہے کہ پڑھتے ہوئے وہ تمام اشیاء آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ جن کا تعلق یہاں کی ثقافت سے جڑ جاتا ہے:

"اسی چولہے کے ساتھ مٹی کا کوزہ، چند پلیٹیں، مٹی کی دو سیاہ ہنڈیاں، لکڑی کا ڈوئی نما چمچ۔ ایلومیم کی ایک بڑی چائے دانی جو چائے پکا پکا کہ اندر اور باہر دونوں جانب سے ہم رنگ اور سیاہ ہو چکی تھی۔ دو چلم، جن میں سے ایک اکثر خیمے سے باہر استعمال کی جاتی تھی... چھت کی مضبوط لکڑی میں بکری کی کھال سے بنائے گئے تین مشکیزے اکثر جھولتے رہتے تھے ان میں سے دو میں پانی اور ایک میں لسی ہوتی تھی۔" ۱۳

ڈاکٹر ضیاء لرا حمٰن کے غیر مطبوعہ افسانے "کھمبا" سے لیے گئے اس اقتباس میں وہ تمام اشیاء استعمال ہوئی ہیں جو یہاں کے قبائلی استعمال کرتے ہیں، مٹی کے برتن ابتدائے زمانہ سے آج تک یہاں کے لوگوں کے استعمال میں ہیں۔ چائے بنانے کے لیے دیگچی کے بجائے چائے دانی آج بھی بلوچ اور پشتون قبائل کے گھروں میں موجود ہے۔ سگریٹ کی بجائے چلم مرد و خواتین دونوں ہی استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ مشکیزہ پانی اور لسی ذخیرہ کرنے کے لیے خانہ بدوشوں کا خاص برتن ہے گھڑے کا استعمال ان کے ہاں نہیں ہوتا کیونکہ یہ بدلتے موسموں کے ساتھ اپنا مسکن بھی تبدیل

کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے ٹوٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مشکیزہ اس حوالے سے ان قبائلیوں کے لیے محفوظ ترین آلہ ذخیرہ آب ہے۔ اس قسم کی تحریریں دور سوئم کے حوالے سے ثقافت کے ہم رنگ ہو جاتی ہیں۔

ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اردو افسانوں میں ثقافتی محرکات کی تشکیل کی وجوہات کیا ہیں؟ لکھنے والوں کی اکثریت انھی موضوعات کو ہی کیوں لیتی ہے؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والا اپنے معاشرے سے کٹا ہوا انسان نہیں ہے۔ وہ اسی کا حصہ ہے۔ نثر کی کسی بھی صنف کو بیان کرنے کے لیے مصنف اپنے ارد گرد کا منظر نامہ الفاظ کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ پہلے اپنے معاشرے کو دیکھتا ہے اور اس کی اچھی اور بری چیزوں کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ معاشرے کا فرد ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ آس پاس کی اشیاء کو تحریروں میں نہ لائے۔ گرد و پیش کی بہت سی اشیاء اس کی تخلیق کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان میں کائنات کی پراسرار حیثیت، درختوں کے درمیان پھیلی تاریکی، پتوں سے ابھرنے والی خوشگوار سائیں سائیں، شہروں کی گہما گہمی اور لوگوں کی کسمپرسی، چالاکی، مشکلات، سچائی کی تلاش، غربت، پریشانیاں، آسودگی وغیرہ اپنے اندر بے پناہ کہانیاں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اب یہ افسانہ نگار کا کمال ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں موجود مظاہر کو کس قسم کے الفاظ میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ بلوچستان کے اردو افسانوں میں ثقافتی محرکات کو تشکیل دینے کی ایک بڑی وجہ ثقافت کے پہلوؤں کی رنگا رنگی ہے۔ لکھنے والے کو بہت سے موضوعات اپنے رہن سہن، رسم و رواج، موسم، مذہب، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ سے متعلق مل جاتے ہیں۔ جن کو بنیاد بنا کر وہ کہانی کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ آج کے مصروف دور میں ادب کا قاری بہت مشکل سے ملتا ہے۔ کمپیوٹر جیسی ایجاد نے قارئین کی تعداد گھٹا دی ہے ایسے میں اگر مصنفین بہت مشکل موضوعات کا انتخاب کریں گے تو اس ادب کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گی۔ لہٰذا آج کے اس مشینی دور میں ایسے ادب پاروں کی تخلیق ضروری ہے۔ جو معاشرے کی سچی تصویریں پیش کریں۔ انسان ہمیشہ سے اپنی روایات پر کاربند رہا ہے۔ اپنی تہذیب و روایات کو تحریروں میں برتنے کی مثالیں اردو کے ابتدائی ادب پاروں میں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً باغ و بہار کی کہانی کے بیان میں استنبول، یمن، دمشق، فارس وغیرہ کا ذکر ہے، کرداروں کا تعلق ان خطوں سے جوڑا گیا ہے لیکن قصے میں ثقافت ہندوستان کی ہے۔ لباس، خوراک، رسوم، تفریحات، طرز تکلم وغیرہ میں ہندوستانی ثقافت نمایاں ہے۔ اس دور کے معاشرت کی تصویر کشی کی وجہ سے کئی صدیاں گزرنے کے باوجود باغ و بہار کو اُتنی ہی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے جتنا کہ میر امن کے اپنے دور میں پڑھا جاتا تھا۔ ادب میں تہذیب و معاشرت کا بیان اسے زندہ رکھتا ہے۔ ثقافت انسانی زندگی کے مختلف مدارج کی کہانی ہے۔ یہ آنے والے وقتوں میں مزید تبدیلیاں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لیے یہ ہر دور میں قبول

عام رہی ہے، تحریروں نے ثقافت کے فکری عناصر کو آج بھی زندہ رکھا ہے۔ مختلف ادوار میں ان کی پیش کش مختلف رہی ہے۔ لیکن لکھنے والوں نے انسانی زندگی کے اس اہم مظہر کو اپنی بساط سے بڑھ کر دوام بخشا ہے۔

---

**حوالے:**


(۱) انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، بلوچستان میں اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۹

(۲) شہناز، ولور، سہ ماہی قلم قبیلہ، کوئٹہ، خوجک روڈ، اگست ۱۹۹۶ تا ۱۹۹۷، شمار نمبر ۱ تا ۴، ص ۱۲۳، ۱۲۲

(۳) نادر قمبرانی (افسانہ) حنابندی، مسودہ غیر مطبوعہ، سال ندارد، ص ۱

(۴) صفیہ پنہاں، دوزخی، ماہنامہ رہبر نسواں، کوئٹہ، اگست و ستمبر ۱۹۴۹ء، ص ۸۴

(۵) ضیاءالرحمٰن، ڈاکٹر، کھمبا (غیر مطبوعہ افسانہ) کوئٹہ، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۱

(۶) دیوالی، ہفت روزہ پاسبان، ۱۲ نومبر ۱۹۴۰ء، ص ۹

(۷) آزادی کی سالگرہ، ماہنامہ رہبر نسواں، کوئٹہ، اگست و ستمبر، ۱۹۴۹ء، ص ۷۰

(۸) عرفان احمد بیگ، گتے کے پہلوان، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، ۲۰۰۱ء، ص ۷۶

(۹) ضیاءالرحمٰن، ڈاکٹر، بلا عنوان، غیر مطبوعہ افسانہ، یکم جون، ۱۹۹۷ء، ص ۳

(۱۰) ضیاءالرحمٰن، ڈاکٹر، مماء مم، غیر مطبوعہ افسانہ، کوئٹہ، ۸ دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۲

(۱۱) عرفان احمد بیگ، گتے کے پہلوان، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، ۲۰۰۱ء، ص ۷۸

(۱۲) خورشید مرزا، بیگم، آپی، کراچی، سالنامہ، ساقی، ۱۹۴۰ء، ص ۱۶۹

(۱۳) ضیاءالرحمٰن، ڈاکٹر، کھمبا، غیر مطبوعہ افسانہ، ۲۸ اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۲